ساری سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔اب سبطین تھا اس کی خالی بیٹھک۔کام وہام کچھ نہیں۔مگر اس صورت حال کو لازمی طور پر جمود تو نہیں کہا جا سکتا علن پنواڑی کی مثال لے لیجیے۔کبھی کسی نے اسے اپنے تھڑے سے اٹھتے نہیں دیکھا۔دن ہو رات ہو وقت ہو بے وقت ہو جب دیکھو علن اپنی دوکان میں موجود۔لیکن اس کے باوجود اس ک زندگی میں حرکت تھی حرارت تھی۔جہاں کالے خاں اور رفیا آ کر بیٹھیں اور جہاں شیرو آ آ کر چکر کاٹے وہاں سے زیادہ حرکت اور حرارت کہاں ہو سکتی تھی۔چراغ سے چراغ جلتا ضرور آیا ہے اور اگر زندگی ارتقا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔لیکن اس کا کوئی واضح ثبوت موجود نہیں ہے کہ سبطین نے علن کی دیکھا دیکھی یاروں کو جمع کرنا شروع کیا تھا۔علن اور سبطین میں یوں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔دل کو سمجھانے کا گر دونوں سے آتا تھا۔اپنی ناکامی کی توجیہات کرنے میں دونوں کو کمال حاصل تھا۔محسوسات کی بنیاد پر معقولات کی عمارت کھڑی کرنے کے انکھڑ کام کو دونوں نے آرٹ کی حد تک پہنچا دیا تھا۔مگر یہ کہنا زیادتی ہوگی کہ سبطین علن کی پیروی کرتا تھا یا علن سبطین کی نقل کرتا تھا۔بس یوں سمجھئے کو دونوں کو ایک ہی قسم کا وجدان عطا ہوا تھا اور اس کے اشارے پر وہ ہمیشہ ایک ہی سمت میں حرکت کرتے تھے۔سبطین کبھی کسی کے گھر یہ کہنے نہیں گیا کہ صاحب آپ ہمارے گھر آیا کیجئے۔چگا تو جہاں ہوتا ہے۔چڑیاں خود ہی پہنچ جایا کرتی ہیں۔پہلے چند پرانے طالب علموں نے جنہیں پروفیسر ڈاکٹر سبطین کی ذات سے عشق ہو گیا تھا آنا جانا شروع کیا پھر ایک افسانہ نگار کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔پھر محلہ کے ایک وکیل صاحب کو یکا یک القا ہوا کہ ڈاکٹر سبطین قانون کا بھی شناور ہے۔اس سے کیوں نہ استفادہ کیا جائے۔پھر نمبردار صاحب چونکے اور انہیں خیال آیا کہ انہیں اپنی بیٹیوں کو کالج میں داخل کرانا چاہیے اور اس سلسلے میں اگر کوئی شخص ان کا ہاتھ بٹا سکتا ہے تو وہ ڈاکٹر سبطین ہے۔محلہ کے ڈاکو نے محض اس بات سے مرعوب ہو کر ڈاکٹر سبطین کے پاس دنیا بھر کے رسالے اور اخبار آتے ہیں بغیر کسی وجہ کے اس کے یہاں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا یوں شہر کے سارے پیاسے کوئیں کے گرد خود بخود جمع ہو گئے۔جو شخص بھی زندگی سے بیزار ہوا اور جسے دنیا میں کہیں ٹھکانا نظر نہ آیا اس نے سبطین کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا۔سبطین اسلامی عوامی انقلابی تحریک کی مسیحائی نہ کر سکا لیکن ویسے اس نے بہت سے لوگوں کے درد کا درماں کیا۔اس زمانے میں ہر احساس پر موت کا احساس غالب آ گیا تھا۔ہر شخص مایوس اور زندگی سے کچھ بیزار سا نظر آتا۔ایسے موقعوں پر کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے۔سبطین نے اس ضرورت کو بڑی خوش اسلوبی سے پورا کیا۔لوگوں کو ایک سہارا ملا اور سبطین کو یہ امید ہو چلی کہ اب اسلامی عوامی انقلابی تحریک پنپ جائے گی۔

اس وقت بحث ایک بہت نازک منزل پر آ پہنچی تھی۔سیاسی موضوعات کی ایک طویل فہرست پر سیر حاصل گفتگو ہو چکی تھی اور ہر مرتبہ آخر میں سبطین کی رائے قطعی قرار پائی تھی۔مگر جب گاندھی جی کی شخصیت معرض بحث میں آئی۔تو حق صاحب نے سبطین کے

نقطہ نظر کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے۔ ''سبطین صاب۔ یوں آپ اس شخص کو کچھ بھی کہیں مگر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اس زمانے کی عظیم شخصیت۔''

حق صاحب کا فقرہ ختم ہو گیا۔ لیکن سبطین کی سگریٹ کا کش کچھ اور زیادہ طویل گیا۔ سگریٹ کا کش ختم کر لینے کے بعد بھی اس نے بولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

نمبردار صاحب نے اس وقفہ کو غنیمت جانا۔ بولے ''بھئی بات یہ ہے کہ یہ اس شخص کا ہی دم ہے کہ ہندوستان میں آج مسلمان زندہ ہیں۔ ورنہ''

حق صاحب کو جوش آ گیا۔ نمبردار صاحب کا فقرہ کاٹتے ہوئے بولے۔ ''یہ واقعہ ہے صاحب اب دیکھے وہ شخص دلی میں خود میواتیوں کے کیمپ میں گیا۔''

''بہت بڑا آدمی ہے صاحب۔'' نمبردار صاحب ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولے۔

سبطین بدستور سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ وہ تو غنیم کو پیش قدمی کا پورا پورا موقعہ دیتا تھا اور پھر اچانک ٹوٹ پڑتا تھا۔

حق صاحب کے لہجہ میں رقت پیدا ہو گئی۔ ''یہ حقیقت ہے کہ اس شخص کے دل میں انسانیت کا بڑا درد ہے۔''

''اس بصیرت افروز حقیقت کا احساس آپ کو یکا یک ۴ جون کی صبح کو ہوا تھا۔''

حق صاحب پہلے ہی حملہ میں ہڑبڑا گئے۔ جیسے تیسے کر کے انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور جواب دینے کی نیت باندھی۔ مگر سبطین تو پے در پے حملوں کا قائل تھا چلتے چلتے ایک اور وار کر دیا۔ ''حق صاحب! ۱۵ اگست کے بعد آپ پر حقیقتوں کا تابڑ توڑ نزول ہو رہا ہے۔ اس کھیپ کو آپ کہاں سنگھوائیں گے۔''

حق صاحب سنبھلے تو خیر کیا تھے۔ لیکن جواب تو بہر صورت ضروری تھا۔ بولے۔ ''سبطین صاحب۔ آپ کا یہ طنز نازیبا ہے۔ گاندھی جی کے سیاسی نظریات سے مجھے اختلاف تھا مگر ان کی شخصی عظمت کا میں ہمیشہ معترف رہا۔''

''اب سیاسی نظریات کے بھی معترف ہو گئے؟''

اس فقرے پہ حق صاحب سٹپٹائے تو بہت۔ لیکن انہوں نے اوسان بجا رکھے اور اقرار اور انکار دونوں سے پہلو بچا کر ایک تیسرا راستہ نکالا۔ ''دیکھئے اس اعتراف یا اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمانہ بدل چکا ہے بعض نئی حقیقتیں ہمارے سامنے آ رہی ہیں اور انہیں ہمیں قبول کر لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

''بس ایک گھونٹ پانی کی ضرورت ہے'' سبطین کا لہجہ بظاہر بہت دھیما تھا۔ ''آپ ان گولیوں کو حلق سے نیچے اتار ہی لیں گے۔ حق صاحب آپ کے ہاضمہ پر مجھے رشک آتا ہے۔''

نمبردار صاحب بحث کو دوسرے رستوں پہ بہک جانے کی اجازت دینے پر آمادہ نہ تھے۔ بحث کو اصل موضوع پر لاتے ہوئے بولے۔ ''اب گاندھی کی وسعت قلب کا''

''وسعت قلب؟'' حمید ڈاکیہ قطعی غیر متوقع طور پر چونکا۔ اب تک وہ صرف سننے کا فرض انجام دے رہا تھا۔ ''آپ تو جی یہ کہتے تھے کہ گاندھی بڑا متعصب اور تنگ نظر''

نمبردار صاحب حق صاحب کے مقابلہ میں زیادہ حوصلہ والے آدمی تھے۔ حمید کی بات کاٹتے ہوئے بہت اطمینان سے بولے۔ ''میرا اعتراض گاندھی جی کی دو ایک باتوں پہ تھا ویسے۔ یہ ان کی انسانیت کا (نمبردار صاحب نے وسعت قلب' کے لفظ کو حذف کر دینا ہی مناسب سمجھا) ثبوت ہے کہ انہوں نے اردو کی حمایت کی ہے۔''

''ہاں صاحب ورنہ اس زمانے میں اردو کی حمایت کی کوئی سیاسی مصلحت تو ہو نہیں سکتی تھی۔''

سبطین چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس نے لپٹے ہوئے بستر پر کمر ٹیک کر پھر سگریٹ کے کش اطمینان سے لینے شروع کر دیئے تھے۔ بحث میں ایک نیا پہلو نکل آیا تھا اور وہ بہت سکون سے سوچ رہا تھا کہ کس پہلو سے دشمن کی جارحانہ کاروائی کا جواب دیا جائے۔ لیکن اتنے میں بیٹھک کا دروازہ کھلا اور اس کے ساتھ ساتھ جنگ کا سارا نقشہ بدل گیا۔ فیاض خاں کو دیکھتے ہی سبطین اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے فیاض خاں تم؟ کونسی گاڑی سے آئے؟ علی گڑھ میں خیریت ہے؟ کھانا کھاؤ گے نا؟ سامان تانگے سے اتار لیا؟''

سبطین نے تو سوالوں کی ایک پوری قطار باندھ دی تھی۔ لیکن فیاض خاں نے صرف آخری دو سوالوں کا جواب دیا۔ اور وہ بہت مختصر ''کھانا کھاؤں گا۔ سامان آ گیا۔''

فیاض خاں آدمی تھا رعب داب کا۔ واقعی پشاور کا پٹھان تھا۔ لمبا تڑنگا۔ سرخ و سفید رنگ۔ جسم بھاری بھر کم نہیں تھا۔ لیکن بدن کی ہڈی چوڑی تھی۔

لباس کے نام خاکی کرتا' خاکی پائجامہ۔ عینک لگی ہوئی۔ سر پر بھورے بھورے خشک بالوں کا ایک چھپر (فیاض خاں کا سر اکثر استرے سے گھٹا ہوا بھی دیکھا گیا تھا) اس درویشانہ حلیہ نے اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا۔ آدمی دیکھتے ہی مرعوب ہو جاتا تھا۔ کمرے میں اس کے گھستے ہی حاضرین میں سناٹا چھا گیا۔

پھر جب کھانا آیا تو تھوڑی دیر تک کمرے میں فیاض خاں کے نوالے چبانے کی آواز گونجتی رہی۔ باقی سب چپ تھے۔ آخر سبطین نے اس سکوت کو توڑا۔ ''بھئی فیاض خاں۔ اردو کا ذکر چل رہا تھا۔ حق صاحب کو اسرار ہے کہ گاندھی جی نے اردو کی حمایت کر کے وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا ہے اور میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ وسیع القلبی کا مظاہرہ ہے وسیع القلبی نہیں ہے۔''

فیاض خاں حق صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''آپ کو نٹ کا تماشہ دیکھنے کا بڑا شوق معلوم ہوتا ہے۔'' اور اس نے ایک چوتھائی روٹی کا نوالہ بنا شوربے میں ڈبو منہ میں رکھ لیا۔

سبطین فیاض خاں کے انداز بیان کو خوب سمجھتا تھا۔ اس فقرے سے وہ بہت مطمئن ہوا۔ لیکن حق صاحب چکرا گئے۔ ''کیا مطلب فیاض صاحب؟''

''مطلب یہ ہے کہ نٹ کا تماشہ دیکھنے کا شوق ہے تو یہاں کیوں وقت ضائع کرتے ہیں۔ جا کر کسی وسیع القلب شخص کی زیارت کیجئے۔''

حق صاحب بہت بھنائے۔ ''آپ صاحب کمال کرتے ہیں۔ آپ وسیع القلبی کو نٹ کا تماشہ بتاتے ہیں۔''

''نٹ کا تماشہ نہ سہی مداری کے ہاتھ کی صفائی سہی۔ بہر حال ایک ہی بات ہے۔ سب وسیع القلب لوگوں کا ایک ہی حال ہے۔ وہ سب کچھ ہوتے بس وسیع القلب نہیں ہوتے۔ دنیا کے سارے آزاد خیال اور انسان دوست بازی گر ہیں اور کچھ نہیں۔ شاید یہ آزاد خیالی کا لفظ کسی بازی گر ہی کے ذہن کی اختراع ہے۔''

فیاض خاں جس راستے پر چل پڑا تھا وہ اس کا اپنا راستہ تھا۔ حق صاحب اور نمبردار صاحب کے تو اس کے تصور سے بھی پر جلتے تھے۔ نمبردار صاحب نے بحث کو کھینچ کر موضوع پر مرکوز کرنے کا فرض پھر انجام دیا۔ ''فیاض صاحب نیت کو نہیں دیکھئے یہ دیکھئے کہ اردو کے بارے میں گاندھی کے اس بیان سے مسلمانوں کو کتنا فائدہ پہنچا ہے؟''

''فائدہ؟'' فیاض خاں رکا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ نوالہ حلق سے نیچے اتر جائے۔ ''اردو کی حمایت اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمنی ہے۔''

حق صاحب اور نمبردار صاحب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ سبطین نے گھور کر فیاض خاں کو دیکھا اور بولا۔ ''وہ کیسے؟''

فیاض خاں نے جواب دیا۔ ''کیسے ویسے کچھ نہیں۔ مسلمان دوسروں کے کہے گھوڑے پہ نہیں بیٹھتے۔ خود ہار کر گدھے کی سواری کر لیتے ہیں۔ پہلے انہوں نے انگریزی پڑھنے سے انکار کیا تھا اور ہندو سے سو سال پیچھے رہ گئے۔ اب ہندی پڑھنے سے انکار کرتے

ہیں۔سوسال اب پیچھے رہ جائیں گے۔"

"دوسوسال" نمبردار کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔" کچھ نوکریاں پہلے ہندو کے قبضہ میں چلی گئیں۔کچھ اب چلی جائیں گی۔"

"اور آپ موچی کے موچی یعنی نمبردار کے نمبردار رہ جائیں گے۔" فیاض خاں نے جس بے ساختگی سے یہ فقرہ کہا تھا اسی بے ساختگی سے گلاس اٹھایا پی کر کلی کی اور چارپائی پر لیٹ کر چادر اوڑھتے ہوئے بولا۔"اچھا بھئی میں سوتا ہوں۔ مجھے صبح ہی دلی جانا ہے۔"

"دلی؟" سبطین کے قدموں تلے کی زمین نکل گئی۔

"ہاں دلی۔"

"کیوں؟"

"علی گڑھ سے تین حرف۔مدرسہ اسلامیہ کا پروانہ آیا ہے۔وہاں جاتا ہوں۔"

"مگر آج کل دلی کی فضا"

"فضاوضا کچھ نہیں میں جارہا ہوں۔اچھا اب مجھے سونے دو۔" فیاض خاں نے کووٹ لے کر چادر میں منہ لپیٹ لیا۔

فیاض خاں نے باتوں کا مزہ کرکرا کردیا۔باتوں سے دھیان ہٹا تو لوگوں کو یاد آیا کہ رات ہوچکی ہے۔فضا کشیدہ ہے۔جلد گھر پہنچ لینا چاہیے۔

حق صاحب راستے میں چلتے چلتے کہنے لگے۔"نراحوش ہے صاحب' اٹھنے بیٹھنے بولنے بات کرنے کی مطلق تمیز نہیں ہے۔دیکھتے تھے کھانا کیسے کھارہا تھا جیسے قیدی کھاتے ہیں۔ایک ایک روٹی کا ایک ایک نوالہ حد ہے۔"

"پشاور کا ڈگا۔نمبردار صاحب نے ساری رات کو ایک اصطلاح میں سمو کر مختصر کردیا۔

حمید ڈاکیہ نے بھی ٹانگ اڑانی ضروری سمجھی۔"کہتا ہے ہندی پڑھو۔"

"یہ سچ کہتا ہے" نمبردار صاحب نے جواب دیا۔"مسلمانوں کے لیے واقعی اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔میں نے تو اپنی لڑکی کے لیے ہندی کے ماسٹر کا انتظام کرلیا ہے۔"

"آپ نے؟" حق صاحب چونکے۔

"صاحب اس میں ایسے چونکنے کی کیا بات ہے؟" نمبردار صاحب کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

''نمبردار صاحب! میں اس پہ نہیں چونک رہا۔ میں تو خود اس کے حق میں ہوں۔ مگر میں نے سنا تھا کہ آپ کی لڑکی آج کل میں پاکستان جانے والی ہے۔''

نمبردار صاحب بات کو ٹالتے ہوئے بولے۔ ''نہیں بھئی راستے مخدوش ہیں ابھی جانے آنے کا کیا سوال ہے۔''

آپ کا خود کا کیا ارادہ ہے؟'' حق صاحب تو بے چارے نمبردار کے پیچھے ہی پڑ گئے۔

نمبردار حسرت بھرے لہجے میں بولے۔ ''ارے بھائی ہم کیسے جا سکتے ہیں۔ آخر ان زمینوں کا کیا کریں؟''

''ہاں صاحب یہی آفت ہے۔''

اس فقرے کے ساتھ ساتھ گفتگو بند ہو گئی۔ البتہ سڑک پر دیر تک قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی۔

فیاض خاں بڑے اطمینان سے پڑا سنا رہا تھا۔ لیکن سبطین بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ شروع میں وہ خود سونے پہ مائل نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑے پریشان اور پراگندہ خیالات تھے جو اس کے ذہن میں چکر کاٹ رہے تھے۔ ایک دو مرتبہ تو اس کے بدن میں جھرجھری سی بھی پیدا ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود ان خیالات میں اسے ایسی لذت محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے نیند کی سرے سے پرواہی نہیں کی۔ لیکن جب اس کے دماغ نے کوئی نئی بات سوچنے سے انکار کر دیا اور وہی پرانی تصویریں بار بار نظروں کے سامنے آنے لگیں تو پھر اسے سونے کا خیال آیا۔ لیکن نیند نہ جانے کدھر سٹک گئی۔ اب ذہن بھی خالی تھا اور آنکھیں بھی۔ اس نے پوری یکسوئی کے ساتھ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔ لیکن ذہن کے کسی کونے کھدڑے سے کوئی بچی کھچی ادھوری تصویر ابھرتی اور بار بار اس یکسوئی میں خلل ڈال دیتی۔ ایک مرتبہ اسے جھپکی آئی بھی تھی۔ لیکن بغیر کسی وجہ کے وہ چونک پڑا۔ اور آنکھ کھل گئی۔ دوسری مرتبہ جب اس پہ غنودگی طاری ہوئی تو وہ واردات گزری کہ جو کوئی بھی ہوتا اس کی آنکھ کھل جاتی سامنے کے مکان کی چھت سے گانے کی آواز آنے لگی۔ یہ آواز اگرچہ بہت دھیمی تھی۔ لیکن اول تو یہ نسوانی آواز تھی۔ پھر اس میں ایک درد کی بھی کیفیت تھی۔ اس لیے اگر سبطین کے کان اس طرف لگ گئے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہوئی۔ نیند کی پریاں جو دبے پاؤں آ رہی تھیں۔ وہ ایکا ایکی پھر غائب ہو گئیں۔ اس کا سامعہ پورے طور پر بیدار ہو گیا۔ گانے کی آواز دھیمی ہوتی گئی، دھیمی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ گنگناہٹ میں تبدیل ہو گئی اور پھر معدوم ہو گئی۔ لیکن سبطین کو یوں محسوس ہوا کہ جہاں سے یہ پرسوز راگ ابھرا تھا وہاں بدستور کوئی چیز دھڑکے جا رہی ہے۔ اس کا دل بھی دھڑکنے لگا لیکن بڑی نرم روی کے ساتھ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بس کبھی کبھی ان پہرے داروں کی آواز آ جاتی تھی جو محلوں میں نئے نئے مقرر ہوئے تھے۔ ہوا خاموش تھی۔ البتہ ستاروں سے لدا پھندا آسمان کچھ متحرک سا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ ستارے

کچھ عجب بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ ایک خاصے رقبے میں تاریکی ہی تاریکی تھی۔ ان میں اکا دکا ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ لیکن بعض مقامات پر ستاروں کا جھرمٹ کچھ اس طرح بن گیا تھا جیسے پھلجھڑی چھوٹ رہی ہو۔ کئی ایک جگہ یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے چمکتے ذروں سے بھری پچکاری چھوڑی جا رہی ہو۔ ایک سمت میں ننھے منے ستارے آپس میں کچھ اس طرح مدغم ہو گئے تھے کہ ان کا الگ الگ وجود بالکل ختم ہو گیا تھا۔ بس یوں لگتا تھا کہ بہت سے ستارے تاؤ کھا کر پگھل گئے ہیں اور آسمان کے دامن پر روشنی کا ایک بڑا سا دھبہ پڑ گیا ہے۔ ان ستاروں کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ فضا کا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے اور آسمان کے جسم میں ایک تھرتھری سی پیدا ہو گئی ہے۔ سبطین نے یوں محسوس کیا کہ خنکی کے نرم نرم گالے پگھل کر اس کی آنکھوں میں گھل مل رہے ہیں۔ لیکن چت پڑے پڑے اسے اب چکھ بے آرامی سی محسوس ہونے لگی تھی اس نے بائیں ہاتھ کروٹ لی۔

فیاض خاں شاید اس کے کروٹ لینے کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ نہ معلوم اس کی آنکھ کس وقت کھل گئی تھی۔ بولا۔ ''سبطین جاگ رہے ہو؟ کیوں، نیند نہیں آتی؟''

''ہاں کچھ نیند اچٹ سی گئی ہے۔''

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''سوچتا ہوں کہ تم دلی جا رہے ہو۔''

''تو پھر؟''

''پھر کچھ بھی نہیں۔''

فیاض خاں نے کچھ جواب نہ دیا۔ دونوں چپ چاپ لیٹے آسمان کو تکتے رہے۔ فضا کا دل اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ دھڑکے جا رہا تھا۔ مشرق کی سمت میں ایک ستارہ ٹوٹا اور ایک سفید دھاری یوں پڑتی چلی گئی۔ جیسے کسی کے گلے میں خراش پڑ جاتی ہے۔

آخر سبطین پھر بولا۔ ''فیاض خاں! سو گئے؟''

''نہیں''

''تم دلی کیوں جا رہے ہو؟''

''جھک مارنے۔''

''اور علی گڑھ میں کیا کرتے رہے تھے؟'' سبطین کو بھی آخر تاؤ آ ہی گیا۔

''جھک مارتا تھا۔''

''پھر یہ دلی کا شوق کیوں چرایا ہے؟''

''علی گڑھ کے نوجوانوں سے جھک ماری اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ اب سوچتا ہوں کہ مدرسہ اسلامیہ کے نونہالوں سے بھی جھک مار کے دیکھ لوں۔''

''میرا مشورہ یہ ہے کہ تم دلی نہ جاؤ۔ پاکستان چلے جاؤ۔ وہاں تحریک کے پنپنے کا بڑا امکان ہے۔''

''تم غلط سمجھتے ہو؟''

''ٹھیک سمجھا ہوں۔''

''سنو۔ علی گڑھ سے بہت سے تالے والے اور کچھ پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر اور چالاک تھانیدار پاکستان گئے ہیں۔ چلتے وقت ان میں سے ہر شخص نے یہی اعلان کیا تھا کہ ہم پاکستان کی تعمیر کرنے جا رہے ہیں۔ پاکستان ان کا استقبال کرے گا۔ ہمارا تمہارا استقبال نہیں کرے گا۔ پاکستان کو اناڑی قفل سازوں پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹروں اور چالاک تھانیداروں کی ضرورت ہے۔ ہماری تمہاری ضرورت نہیں ہے۔''

''میں نہیں مانتا۔''

''مت مانو۔''

''تم دلی جا کر وقت ضائع کر رہے ہو۔''

''وقت تو ضائع ہو چکا۔ وقت اب ہے کہاں جو ضائع کروں۔'' گفتگو کے دوران میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ فیاض خاں کے لہجہ میں رقت کی کیفیت پیدا ہوئی۔

سبطین نے پھریری لی اور بولا ''وقت ضائع نہیں ہوا ہے۔ وقت نے کروٹ لی ہے۔''

فیاض خاں نے بڑے طنز سے پوچھا۔ ''کیا پاکستان جانے کا منصوبہ ہے؟''

''نہیں۔ ہرگز نہیں۔'' سبطین نے بڑے طنطنہ سے جواب دیا۔

''پھر مجھے کیوں ہدایت کی جا رہی ہے؟''

''میں جاؤں گا تو یہ فرار ہوگا۔ تم جاؤ گے تو یہ وطن کو واپسی ہوگی۔''

فیاض خاں نے ایک زور قہقہہ لگایا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ فضا بدستور جاگ رہی تھی۔ سکوت کا بے پایاں راگ درد و سوز کی مخصوص کیفیت کے ساتھ نرم روی سے کروٹیں لیے جا رہا تھا۔

''سبطین'' اس مرتبہ فیاض خاں کی طرف سے پہل ہوئی۔

''ہوں۔''

''یہ سامنے والے مکان میں کون آ کے رہا ہے؟''

سبطین چونک پڑا۔ ''کوئی نہیں۔ عجیب سے لوگ ہیں۔ مرد راتوں کو جانے کہاں مٹر گشتیاں کرتا ہے۔ عورت آہیں بھرتی ہے یا کلیلیں کرتی ہے۔''

''تمہارا اس سے کوئی تعلق ہے؟''

اس دوٹوک فقرے پر سبطین ہڑبڑا گیا۔ ''نہیں..... نہیں۔ کیوں۔''

''نہیں ہے تو پیدا کر لو۔'' فیاض خاں نے اپنے معروضی انداز میں اب تک کوئی فرق نہیں آنے دیا تھا۔

سبطین نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

''میرا وجدان کہتا ہے۔ کہ تم کسی نہ کسی روز ضرور محبت کرو گے۔''

سبطین بھنا کر بولا۔ ''اچھا وجدان ہے تمہارا۔''

''میرا وجدان کبھی غلط نہیں کہتا۔'' فیاض خاں نے بڑے اطمینان سے کہنا شروع کیا۔

''دراصل تم میں سوائے عورت سے محبت کرنے کے اور کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ تم اب تک اپنے آپ کو نہیں پہچانے۔ تم ہمیشہ وقت کے بعد جاگتے ہو۔ ایک روز تمہیں یکا یک اپنی اصل صلاحیت کا پتہ چلے گا اور تم کسی لڑکی سے محبت کرنا شروع کر دو گے۔ مگر اس وقت وہ تمہیں منہ نہیں لگائے گی۔ ابھی موقعہ ہے۔ وقت ضائع نہیں ہوا ہے۔''

''اچھا چپ رہو۔'' سبطین کا غصہ سے برا حال ہو گیا تھا۔

فیاض خاں چپ ہو گیا۔ چند منٹ تک پھر خاموشی طاری رہی۔

''اچھا سبطین یہ بتاؤ کہ اس شخص کی عمر کیا ہو گی؟'' فیاض خاں کرید کرید کر پوچھے جا رہا تھا۔

''ادھیڑ عمر کا آدمی ہے۔''

''بیوی جوان ہے؟''

''بالکل جوان'' سبطین کو غصہ بھی آ رہا تھا اور جواب بھی بڑے شوق سے دے رہا تھا۔

''لڑکی ہے یا عورت؟''

''میں اس کا نکاح پڑھانے نہیں گیا تھا۔ جو مجھے اس کی عمر معلوم ہوتی۔'' سبطین کو پھر تاؤ آ گیا۔

''فیاض خاں نے بہت سکون سے جواب دیا۔ ''بچوں کی سی باتیں نہ کیا کرو۔ لڑکی اور عورت میں فرق عمر کا نہیں ذہنیت کا ہوتا ہے۔''

''تو پھر یہ عورت ہے۔''

''عورت ہے؟'' فیاض خاں چونکا۔ ''معاملہ ٹیڑھا ہے۔ اب تم ہاتھ مت ڈالنا۔''

''کیا مطلب؟''

''بات یہ ہے کہ لڑکی کا معاملہ تو بہت سیدھا سادہ ہوتا ہے۔ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ۔ مرجھلے سے مرجھلا مرد بھی غریب کو دبوچ لیتا ہے۔ لیکن عورت خوفناک چیز ہوتی ہے۔ وہ خود مرد کو دبوچ لیتی ہے۔ ایسے جیالے تو کم ہی دیکھے ہیں جو عورت پر غالب آ جاتے ہیں۔''

''اپنے متعلق کیا خیال ہے تمہارا؟'' سبطین نے جل کر پوچھا۔

''اپنے متعلق؟'' فیاض خاں سوچتے ہوئے بولا۔ ''کبھی کبھی مجھ میں بڑی شدت سے یہ امنگ پیدا ہوتی ہے کہ یہ دھندا چھوڑ دو اور کسی عورت سے ٹکر لو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں عورت پہ غالب آ جاؤں گا اس لیے میں ارادہ ملتوی کر دیتا ہوں۔''

سبطین نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ ہونے کے سوا اس کے لیے اور چارہ بھی کیا تھا۔ اتنے میں دور سے گھنٹے کی آواز آئی۔ ایک بج رہا تھا۔ سبطین نے آنکھیں بند کر لیں۔ ''اچھا اب سو جاؤ۔ آدھی رات گزر گئی۔''

فیاض خاں چادر میں منہ لپیٹتے ہوئے بولا۔ ''آدھی رات ابھی اور باقی ہے۔''

سنسان بیابان فضا میں زرد رو چاند اکیلا رینگ رہا تھا۔ خوف و ہراس کی ایک مبہم پراسرار کیفیت چاندنی کی نس نس میں رچی ہوئی تھی۔ بلند و بالا عمارتیں، درخت، ٹیلے یہ سب یوں چپ چاپ کھڑے تھے گویا کسی نامعلوم خوف کے اثر سے سکتہ میں آ گئے ہیں۔ ایک مسجد کے سفید مینار آسمان کی طرف کچھ یوں اٹھے ہوئے تھے گویا تھکے ماندے چاند کو سہما ہوا دیکھ کر بے قراری میں کسی کی باہیں اٹھ گئی

ہیں اور اجلے گنبدوں کو دیکھ کر کچھ ایسا گمان گزرتا تھا کہ ایک محبت بھرا سینہ کسی کو اپنے اندر چھپا لینے کے لیے بے تابی سے دھڑک رہا ہے۔ رستے ویران پڑے تھے۔ گلیاں اور سڑکیں ہو حق کر رہی تھیں۔ پھیکی پھیکی چاندنی۔ سہمی ہوئی فضا۔ چپ چاپ بلند و بالا مکان۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس بستی کے سارے لوگ کہیں باہر چلے گئے ہیں اور یہ مکان ڈھنڈار پڑے ہیں اور پھر یوں محسوس ہوتا کہ ان میں پراسرار روحیں چل پھر رہی ہیں' پھر اچانک کسی بہت دور کی گلی سے ایک قد آور سایہ نکلتا نظر آتا۔ وہ ایک ڈگ میں ایک گلی اور دوسرے ڈگ میں دوسری گلی پار کرتا اور بڑھتا چلا آتا۔ اونچی اونچی چھتوں اور مسجد کے گنبدوں پر اس کی ڈراؤنی پرچھائیں کانپتی نظر آتی اور پھر بالا قد درختوں اور میدانوں میں سرکتی دکھائی دیتی۔ سایہ ڈگ بھرتا ہوا دور نکل جاتا اور نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا اور گلیاں پھر بھائیں بھائیں کرنے لگتیں۔ یوں لگتا کہ فضا کی گھگھی بندھ گئی ہے۔ ایکا ایکی کسی نامعلوم سمت سے ایک عقاب آہستہ آہستہ اڑتا ہوا آیا۔ ایک منحوس پرچھائیں پھر اونچی اونچی چھتوں اور مسجد کے گنبدوں پر کانپتی دکھائی دی۔ عقاب اڑتا اڑتا کسی نامعلوم سمت میں کھو گیا۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ چاند کا رنگ کچھ اور پھیکا پڑ گیا۔ جیسے کسی لق و دق صحرا میں کوئی مسافر قافلہ والوں سے چھٹ کر راستہ بھول جائے اور شروع شروع میں خوب دوڑے۔ اتنا دوڑے کہ ہانپنے لگے اور پھر تھک کر رینگنا شروع کر دے۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت چاند پر گزر رہی تھی۔ فضا کے ویران اجاڑ بن میں وہ اکیلا بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اتنے میں کسی دور کی گلی سے کسی کے نوحہ کرنے کی پراسرار آوازیں آئیں۔ یہ پراسرار دھیمی آوازیں چند لمحوں کے لیے تیز ہو گئیں۔ مگر پھر مدھم پڑ گئیں۔ چاند کی شکل بدلنے لگی اس کا ایک کنارہ سرخ پڑ گیا۔ جو مکان سنسان و ویران پڑے تھے وہ ایکا ایکی ایک خوفناک قسم کے شور سے گونج اٹھے۔ عورتیں' بچے اور مرد چھتوں پر چڑھ گئے تھے اور شور مچا رہے تھے' چیخیں مار رہے تھے۔ پھر ننگ دھڑنگ فقیروں کا ایک گروہ سرپٹ آتا دکھائی دیا۔ میلے کچیلے سیاہ تو اجسم' ڈراؤنے چہرے' لال لال آنکھیں' گردنوں کی رگیں پھولی ہوئی' سانس چڑھے ہوئے۔ انہوں نے گلوں میں جھولیاں ڈال رکھی تھیں۔ وہ دوڑتے' ہوئے چل رہے تھے اور بے طرح شور مچا رہے تھے۔ سیاہ کتوں کا ایک پورا ہجوم بھونکتا ہوا ان کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ ہر دروازے پر پہنچ کر وہ گودیاں پھیلا دیتے اور گودیوں میں اناج آ پڑتا۔ وہ پھر دوڑتے ہوئے آگے بڑھتے اور سیاہ کتے جو انہیں رکتا ہوا دیکھ کر چپ ہو جاتے تھے پھر بھونکتے ہوئے دوڑنے لگتے چاند پر ایک کرب کی کیفیت طاری تھی۔ سرخی پھیلتی گئی' گہری ہوتی گئی۔ سرخی اور پھیلی اور گہری ہوئی۔ آدھا چاند سرخ ہو گیا' آگ کے انگارے کی طرح دہکنے لگا' تلوار کے گھاؤ کی طرح خونا خون ہو گیا۔ پھر ایک سمت سے غبار اٹھا۔ زرد زرد غبار بلند ہوتا گیا' پھیلتا گیا۔ آندھی کے جھکڑ چلنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے فضا میں مکروہ صورت عورتوں کا جلوس' نمودار ہوا خون سے لت پت بے سر کے جسموں پر وہ سوار تھیں۔ ان کے لمبے لمبے خشک بالوں سے

آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور بل کھاتا ہوا سیاہ دھواں ان کے منہ سے نکل رہا تھا۔ ان کی زبانیں نکلی ہوئی تھیں۔ ان سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور اس جلوس کے ساتھ ساتھ گرج کی آواز سنائی دی۔ زمین ہلنے لگی۔ عمارتیں اڑا اڑا دھم کر کے گرنے لگیں۔ لوگ گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ مسجد کے مینار سرنگوں ہو گئے اور فضا میں ایک گرجدار آواز گونجی "گر پڑا۔ بڑا شہر گر پڑا۔" کسی نامعلوم سمت سے کسی کے نوحہ کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ "اے بڑے شہر۔ اے بستیوں کی ملکہ افسوس۔ افسوس۔ افسوس" ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ بوجی کی آنکھ کھل گئی۔ ان کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اور دل' بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز بار بار بڑی تیزی سے سینے کی پسلیوں سے آ کر ٹکراتی ہے اور بار بار ایسا لگتا کہ اب پسلیاں چٹخیں اور اب کلیجہ اچھل کر باہر نکلا۔ بوجی کو بہت دیر تک تو یہ احساس ہی نہ ہوا کہ وہ وقعی جاگ پڑی ہیں۔ وہ پوری فضا اپنی شدت کے ساتھ ان کے تصور پر بدستور سوار رہی۔ البتہ اس کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا تھا۔ کبھی کوئی تصویر نظر کے سامنے آ جاتی۔ کبھی اس نوحہ کی آواز سنائی دینے لگتی۔ اے بڑے شہر۔ اے بستیوں کی ملکہ۔ افسوس۔ افسوس۔ افسوس۔ لیکن وقت بڑا ظالم ہے۔ کیسی ہی شدید کیفیت ہو' وقت کے ساتھ خود بخود دھیمی پڑنے لگتی ہے۔ آخر بوجی کی طبیعت ذرا ٹھکانے آئی۔ جو وہ واقعی جاگ اٹھی تھیں۔ انہیں اب ہوش آیا کہ دراصل یہ سب کچھ واقعی ہوا نہیں ہے' محض اک خواب تھا۔ انہوں نے بڑے خلوص سے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ محض ایک ڈراؤنا خواب تھا' ایک وسوسہ تھا' شیطان نے انہیں ڈرایا تھا۔ اس کی وجہ بھی ان کی سمجھ میں دراصل بہت جلد آ گئی۔ ہوا یوں کے سوء اتفاق سے ان کی جوتیاں سرہانے پڑی رہ گئی تھیں۔ جب جوتیاں سرہانے پڑی ہوں تو پھر اگر ڈراؤنے خواب نہ دیکھیں تو واقعی تعجب کی بات ہے۔ لیکن اس معقول توجیہہ کے باوجود بوجی کا وسوسوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ انہیں بار بار اپنی اماں جی کی یہ روایت یاد آتی تھی کہ ۵۷ء سے پہلے ایسا چاند گہن پڑا تھا کہ پورا چاند گہنا گیا تھا۔ اور اس روایت کے خیال کے ساتھ ساتھ ان کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ جاتی تھی۔

بوجی نے صبح کی اذان کا مطلق انتظار نہیں کیا۔ انہیں وقت کی یوں بھی بہت اٹکل تھی اور پھر ستاروں کی نقل و حرکت نے بھی ان کی تھوڑی بہت مدد ضرور کی تھی۔ انہوں نے منہ ہاتھ دھویا وضو کیا اور جانماز پر کھڑی ہو گئیں۔ نماز تو انہوں نے جلدی ہی ختم کر لی۔ لیکن تسبیح کا ورد صبح تک جاری رہا۔ جب ذرا اجالا ہوا تو انہوں نے کلام مجید کا جزدان کھول کر اپنی عینک نکالی۔ پھر تلے دانی کھولی۔ اس میں سے تعبیر نامہ نکالا۔ گ کی تختی میں کئی مقامات پر ان کی نظر اٹکی۔ گاجر دیکھنا۔ گائے دیکھنا۔ گہن دیکھنا۔ ان کی نگاہیں ٹھٹھکیں اور پھر آگے بڑھ گئیں۔ گہن چاند کا دیکھنا۔ انہوں نے غور سے اس کی تعبیر پڑھی لکھا تھا۔ "کال پڑے یا بادشاہ پہ آفت آئے۔ رعایا پریشان ہو۔ جان و مال کا نقصان ہو۔ چاہیے کہ خواب کسی سے نہ کہے۔ رفع بلیات کی خاطر صدقہ دے۔"

گلشن اٹھ بیٹھی تھی۔ باورچی خانے میں وہ کچھ سٹر پٹر کر رہی تھی۔ یوں تو وہ بہت دیر سے بڑا بڑا رہی تھی۔ مگر ایک مرتبہ اس نے شاید بوجی کو سنانے کی غرض سے اونچی آواز سے کہا۔ ''کمبخت کا تختہ نکلے' قبر میں وس کی کیڑے پڑیں۔ نرا پانی سا دودھ دے جاوے ہے کل آئے حیضی بچہ وس کے منہ پر ماروں گی۔'' گلشن کے فقرے خاصے فکر انگیز تھے۔ لیکن بوجی کو مطلق تحریک نہیں ہوئی۔ ان کی حالت اس وقت بھی غیر تھی۔ ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ چہرہ پیلا پھدق پڑا تھا۔ گلشن کے فقروں کو انہوں نے سرے سے ہی نظر انداز کر دیا۔ انہوں نے خاموشی سے جانماز لپیٹی اور ہلتی کانپتی اندر چلی گئیں۔ صندوق کھول کر انہوں نے اپنا کپڑے کا بٹوا نکالا اور پھر گلشن کو کانپتی ہوئی آواز میں بلایا۔ ''گلشن اری او گلشن۔ اری یاں آئیو۔''

گلشن دودھ کے متعلق اظہار خیال سے تو بے شک اس وقت تک فارغ ہو چکی تھی۔ لیکن چائے کے ڈبے میں جھاڑو ڈلی ہوئی دیکھ کر اس کا پارہ پھر چڑھ گیا تھا اور اس وقت وہ رفیا کو غائبانہ لعنت ملامت کر رہی تھی۔ بوجی کا یہ بے وقت بلاوا اسے بالکل پسند نہ آیا۔ بلکہ اس نے صاف صاف کہہ بھی دیا کہ ''اجی میری دو ٹانگیں ہیں۔ چار ٹانگیں کاں سے لی آؤں۔ جا بناؤں یا تمہاری سنوں۔'' مگر اس فقرے سے تعمیل حکم میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ تو محض ایک واقعہ کا اظہار تھا یا زیادہ سے زیادہ حرف شکایت یا صدائے احتجاج۔ گلشن جب کمرے مین پہنچی تو بوجی بٹوے سے پانچ روپے کا نوٹ نکال چکی تھیں۔ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولیں ''بی بی رفیا کو جا کے یہ پانچ روپے دے کہ بزار سے گیہوں خرید کے محتاجوں میں بانٹ دے اور لے اٹھنی اور دوں ہوں۔ ان کے پیڑے کے نکڑ شاہ کے مزار پہ چڑھایا۔''

گلشن کا سارا غصہ رفو چکر ہو گیا۔ اب وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ غصے کا بھی وقت اور موقعہ ہوا کرتا ہے۔ گلشن نے کبھی بے وقت غصے کا اظہار نہیں کیا۔ اس بے وقت خیرات پہ وہ حیران تو بہت ہوئی لیکن چونکہ بوجی اس راز پر سے پردہ اٹھانے سے گریز کر رہی تھیں۔ اس لیے اس نے بھی انہیں چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ جب بھی کوئی سنگین مسئلہ درپیش ہوتا۔ تو بوجی ہزار اختلافات کے باوجود خود گلشن سے رجوع کرتی تھیں۔ لیکن جب وہ پراسرار طور پر چپ سادھ لیتیں' تو پھر گلشن اپنے وجدان کے زور پر مسئلہ کی تہہ تک پہنچتی تھی۔ اس وقت بھی اگرچہ اسے وقعہ کا علم نہ تھا مگر واقعہ کی نوعیت کو وہ ضرور بھانپ گئی تھی۔ اس نے فی الحال چپ رہنے کا ہی ارادہ کیا تھا۔ اس سنجیدہ محفل میں جس نے جوتی اچھالی وہ سبطین تھا بوجی کو یہ خبر ہی نہ ہوئی تھی کہ سبطین کس وقت اٹھا اور کس وقت کمرے میں آ بیٹھا۔ شاید یہ سب کچھ ان کی نماز کے دوران میں ہوا تھا۔ سبطین اس وقت کسی کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ بوجی کی نقل و حرکت اور گفتگو پہ وہ چونکا۔

''بوجی صبح ہی صبح یہ کیا ہو رہا ہے؟''

بوجی بہت سٹپٹائیں۔ ''ارے بیٹا وہ پہلی تاریخ کو نیاز کا نکالنا بھول گئی تھی۔ آج مجھے خیال آیا۔''

''بھول گئی تھیں تو بس بھول جاؤ۔ یہ تمہیں بھولی ہوئی باتیں رہ رہ کے کیوں یاد آیا کرتی ہیں۔''

بوجی کو بیٹے کا یہ انداز گفتگو پسند نہ آیا۔ پھر بھی انہوں نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ ''ارے بھئی مجھے شک آوے ہے۔ اللہ سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔''

''اچھا شک ہے تمہارا۔ اور حفظ وامان میں تو ہیں۔ آخر کونسی قیامت ٹوٹ رہی ہے۔'' سبطین تو بوجی کے پیچھے ہی پڑ گیا۔

مگر بوجی نے پھر بھی نرمی ہی سے جواب دیا۔ ''ارے بیٹا ایسی بدشگنی کی آواز نہیں نکالا کرتے۔ اور بھئی پیسے کا کیا ہے۔ اپنے ہاتھوں کا میل ہے۔ پیروں فقیروں کے نام نکالتے ہوئے کڑھا نہیں کرتے ہیں۔''

سبطین اور گرم ہوا۔ ''اجی ان پیروں فقیروں کے ٹبر کو کب تک برداشت کروگی۔ چھٹی کرو نا ان کی۔''

بوجی اس مرتبہ تو تلملا ہی اٹھیں۔ جھلا کر بولیں۔ ''ارے لڑکے ہوش کے دوالے۔ زبان میں ذرا لگام نئیں ہے۔ سوچے نہ سمجھے جو منہ میں آئی کہہ دیا'' اور یکا یک وہ دوسرے رستے پہ چل پڑیں۔ ''ارے بھی میرے تو ہولیں اٹھے ہیں۔ آجکل کے دن ویسے ہی خراب ہیں۔ اللہ اپنا رحم کرے۔ مجھے طرح طرح کے خیال آوے ہیں۔ مجھے تو راتوں کو نیند نئیں آتی۔'' بوجی کچھ کہتے کہتے یکا یک چپ ہوگئیں۔

گلشن اب تک خاموش تھی۔ مگر اب اس کے بولنے کا موقعہ آ گیا تھا۔ اس موقعہ کو اس نے گنوانا مناسب نہ سمجھا۔ ''اجی بوجی تین دن سے میری سیدھی آنکھ پھڑک رئی ہے۔ اللہ خیر کرے۔''

بوجی نے فوراً اس کی زبان بندی کردی۔ ''ارے بھئی ایسی آواز منہ سے مت نکالو۔ مجھ رانڈ کا دل ویسے ہی وائی توائی ہے۔ مجھے تو اس گھر کو دیکھ دیکھ کے حفقان ہووے ہے جنیں کیا بات ہے'' بوجی بولتے بولتے پھر رکیں اور کچھ سوچ کر یکا یک بولیں۔ ''اری گلشن تو ذرا چاسے فارغ ہو کے مولوی صاب کے پاس تو جائیو۔ کہنا کہ ہمارے گھر کو کیل دو۔''

اس آخری فقرے پر سبطین بہت گرمایا۔ ''اجی بوجی یہ کیلنا ویلنا تم نے کیا لگایا ہے۔''

مگر بوجی نے اس مرتبہ اسے اچھی طرح ڈانٹ دیا۔ ''ارے چل رے لڑکے۔ ہمارے آگے کا لونڈا ہمیں نصیحت کرے ہے۔ تجھے کیا ضرورت ہے ان باتوں میں ٹانگ اڑانے کی۔ جا اپنے انہیں سنڈوں مسنڈوں میں جا۔ ان سے مغز مارا کر۔''

سبطین کی ساری گرمی بھاپ کی طرح اڑ گئی۔ موقعہ غنیمت جان کر گلشن نے بھی اپنی بزرگی جتانے کے لیے ایک فقرہ کہہ ڈالا۔

''ہاں جی سپومیاں تم کیا جانو ان باتوں کو۔ اللہ رکھو تم جوان ہو پر یہ مطلب تھوڑائی ہے کہ تم بوجی کو نصیحتیں کرو۔ ون کے لیے تو تم کل کے لونڈے ہی رہو گے۔''

اور بوجی نے چلتے چلتے گلشن کو ایک اور ہدایت کی۔ ''اور دیکھ رہ گلشن۔ نمبردارنی کے گھر اور وکیل صاحب کے اور کوٹھے والی کے کہہ آئیو کہ جمعرات کو ہمارے گھر مجلس ہے۔''

حق صاحب نے نہ معلوم کیا سوچ کر پھر قوم کی رہنمائی کرنے کی ذمہ دار سنبھال لی تھی مگر ایک نئے انداز سے۔ سیاست سے تو وہ کئی مہینے پہلے کنارہ کش ہو کر گیان دھیان میں مصروف ہو گئے تھے۔ جون ۴۷ء کا پورا مہینہ تو انہوں نے سوچ بچار میں گزارا تھا۔ مہینے بھر تک ان پر تذبذب کی ایک کیفیت طاری رہی۔ مگر مہینے کے ختم ہوتے ہوتے انہوں نے قطعی فیصلہ کر ہی لیا اور شہری مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے کہ انہیں یکا یک گاندھی جی کی انسان دوستی کا احساس ہوا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی آزاد خیالی کا بھی پتہ انہیں اسی زمانے میں چلا تھا۔ جہاں تک مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلق ہے تو خود ان کی روایت یہ ہے کہ وہ بہت پہلے سے ان کے علم و فضل کے قائل تھے انہوں نے لالہ رگھوبر دیال بزاز کی دوکان پر بیٹھ بیٹھ کر برملا ان خیالات کا اظہار کیا۔ انہیں یہ بات کھائے جاتی تھی کہ انہوں نے اپنی ساری عمر ایک فرقہ پرست جماعت کی خدمت میں گنوا دی۔ ساتھ ہی انہیں اس کا احساس تو ضرور تھا کہ کسی قسم کی بھی کمیٹی بنے کانگریسی مسلمانوں ہی کی اس میں پوچھ ہوتی ہے اور راشننگ کے دفتروں میں تو وہ درانہ گھسے چلے جاتے ہیں اور پانچ پانچ سیر چینی اور بیس بیس گز کپڑے کے پرمٹ چکیوں میں بنوالاتے ہیں لیکن اس احساس کی حیثیت تو ثانوی تھی۔ زیادہ تر تو انہیں ان کا ضمیر ان کی فرقہ پرستانہ سرگرمیوں پر ملامت کر رہا تھا۔ کوئی بھلا مانس ہوتا تو ان کی قلب ماہیت کی قدر کرتا اور انہیں سینے سے لگا لیتا۔ لیکن لالہ رگھوبر دیال توتس سے مس نہ ہوئے اور نہ ان کی دوکان پہ بیٹھنے والے دوسرے لوگوں نے ان کی باتوں پر توجہ دی۔ چنانچہ جب بقرعید آئی اور مسلمانوں میں شکر اور کپڑا تقسیم کرنے کے لیے کمیٹی بنائی گئی تو اس میں حق صاحب کو صاف نظر انداز کر دیا گیا۔ امن کمیٹیاں بھی محلہ محلہ بنیں مگر حق صاحب غریب کہیں نہ تھے اس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے مایوس ہو کر دنیا کے جھگڑوں سے ہی قطع تعلق کر لیا اور گوشہ نشین بن گئے۔ لیکن جب قریب و دور سے فسادات کی خبریں آنی شروع ہوئیں اور شہر کی فضا روز بروز کشیدہ ہوتی گئی تو اس سے ان کے ایرا پھیری کے میلان کو شہ ملی۔ سبطین نے تو جلسہ میں کئی مرتبہ ان کی ٹانگ لی تھی۔ لیکن وہ کافی سخت جاں نکلے اور آخر شہر کے مسلمانوں کے منظم کرنے اور ڈھارس بندھانے کا فرض انہیں سونپ ہی دیا گیا۔

حق صاحب نے اپنا فرض بڑی تندہی سے انجام دیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر یہ کیفیت ہوئی کہ محلہ کی دیواروں میں ایک نئی روح

دوڑتی نظر آنے لگی۔ ''اسلام عمل کا نام ہے۔'' ''مسلمانو عمل کرو'' ''نماز سب سے بڑا عمل ہے'' ''روز محشر کہ جاں گداز بود۔ اولیں پرسش نماز بود۔'' اور ان فقروں نے وہ زور باندھا کہ دیواروں پر جتنے نئے پرانے اشتہاری اور غیر اشتہاری فقرے لکھے ہوئے تھے وہ سب ماند پڑ گئے۔ حق صاحب نے محض اس پروپگنڈا مہم پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ چند عملی اقدامات بھی کئے فیصلہ کیا گیا کہ جو شخص مغرب عشا کی نماز پر مسجد میں نہ پہنچے اس پر چونی جرمانہ کیا جائے۔ جن ان پڑھ مسلمانوں کو کلمہ یاد نہیں تھا انہیں کلمہ یاد کرانے کی بھی مہم شروع کی گئی۔ اس کام میں اگرچہ نمردار صاحب اور حمید ڈاکیہ نے ان کا بہت ہاتھ بٹایا لیکن خود انہوں نے بھی چار پانچ آدمیوں کو کلمہ سکھایا تھا۔ عدم تعاون کی شکایت دراصل انہیں سبطین سے تھی۔ سبطین نے ان کی ہر تجویز پر فقرہ بازی کی اور ہر اقدام کا مذاق اڑایا۔ رفیا کو اگر حق صاحب کلمہ نہ سکھا سکے تو اس میں صرف رفیا کی جہالت کا ہی نہیں سبطین کا بھی قصور تھا۔ رفیا ''لا'' تو بڑی آسانی سے کہہ لیتا تھا۔ ہاں ذرا ''الہ'' کے لفظ پر اس کی زبان لڑکھڑانے لگتی تھی۔ الا اللہ کی منزل تک پہنچنے کا کبھی سبطین نے ہی موقعہ نہیں دیا۔ وہ تو بے ساختہ ہنس پڑتا تھا۔ اور رفیا کے آئے حواس گم ہو جاتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ حمید ڈاکیہ کی کوششیں سب سے زیادہ بار آور ثابت ہوئیں۔ اس نے اسٹیشن پر پہنچنا شروع کر دیا۔ اسٹیشن پر جو گاڑی آ کر کھڑی ہوتی وہ مسلمانوں کے کسی ڈبے میں پہنچتا اور لوگوں کو خوف خدا سے ڈراتا اور کلمہ سیکھنے کی تلقین کرتا۔ اندھا دھند چلتی ہوئی گاڑیوں کے مسافر یوں بھی رشد و ہدایت کی روشنی قبول کرنے پر ذہنی طور پر تیار ہوتے ہیں اور اس زمانے میں تو خیر ہر مسلمان سفر کو زندگی کی سب سے بڑی آزمائش سمجھتا تھا اور خوف خدا سے خود بخود دوڑنے لگتا تھا۔ حمید ڈاکیہ نے سینکڑوں کو کھڑے کھڑے کلمہ سکھا دیا۔ لیکن علن کی دوکان پر اسے سخت آزمائش سے گزرنا پڑا۔ علن کمبخت نے تو ہر قدم پر اتنے سوال اٹھائے کہ حمید کیا کوئی بھی ہوتا اس کے پیر اکھڑ جاتے۔ ہر سوال کا معقول جواب پانے کے بعد بھی اس کی موٹی عقل میں یہ بات نہ آئی کہ آخر اس زمانے میں یکا یک کیوں حق صاحب کو کلمہ سکھانے کا خیال آیا ہے۔ کالے خاں کو جب کلمہ سیکھنے کی دعوت دی گئی تو اس کی اسلامی غیرت ایسی جوش میں آئی کہ اس نے حمید ڈاکیہ کو برملا سنائیں اور علی الاعلان کہا کہ ''بابو ہمیں کلمہ پڑھانے آیا ہے۔ ابے ہم تجھے الٹا کلمہ پڑھوا دیں گے۔'' کالے خاں کو دعویٰ تو یہی تھا کہ وہ کلمہ جانتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس نے محمد رسول اللہ کو ہمیشہ محمد رسول اللہ کہا۔ اب اس کی زبان کون پکڑتا۔ اس کے تو ہاتھ تک پکڑنے مشکل ہوتے تھے۔ شیرو سے جب کلمہ سیکھنے کو کہا گیا تو پہلے تو حمید ڈاکیہ کو وحشیانہ انداز میں گھورتا رہا۔ پھر بولا ''یاد ہے۔ جا اپنے وکیل صاب سے کہہ دیجو کہ شیرو کو کلمہ یاد ہے۔'' اور یہ فقرہ اس نے ایسے قطعی انداز میں کہا کہ حمید ڈاکیہ کو کچھ اور پوچھنے کی جرات ہی نہ ہوئی۔

علن کی دکان پر بیٹھنے والے دراصل کسی اور ہی فکر میں گرفتار تھے۔ ذریعہ کا حال اللہ بہتر جانتا ہے لیکن خبریں پل پل کی یہاں

پہنچتی تھیں۔ یہ خبر مٹھوا بننے والے نے اڑائی تھی۔ کہ جنرل موہن سنگھ کی فوجوں نے پنجاب فتح کرلیا۔ علن اس خبر کو جھٹلا تو نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس کا دل اندر سے کہہ رہا تھا کہ یہ خبر غلط ہے کالے خاں کا منہ اتنا سا نکل آیا۔ رفیا کی بھی سٹی گم تھی۔ لیکن آخر اس طلسم کو پھر رفیا نے ہی توڑا۔ یہ خبر اسی نے آخر سنائی تھی کہ گاما اپنے پٹھوں کو لے کر امرتسر سے نکل پڑا ہے پھر کیا تھا۔ سوکھے دھانوں پہ پانی پڑ گیا۔ کالے خاں مر کے جی اٹھا۔ لیکن علن کو ابھی اچھی طرح یقین نہیں آیا تھا۔ جب رفیا نے اسے بتایا کہ گاما اور جنرل موہن سنگھ کا ایک ایک پانی بھی ہو چکا ہے اور جنرل موہن سنگھ نے دو فائر کئے اور دونوں گاما نے اپنے سینے پہ روک لیے تو علن کو پھر اس واقعہ پر ایمان لانا ہی پڑا۔ مٹھو بننے والا تو کسی طرح اسے سچ مانتا ہی نہ تھا لیکن جب اس نے لڑائی کی تفصیلات سنیں تو اسے سوائے یقین کر لینے کے اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ البتہ اسے یہ سن کر بہت سکون ہوا کہ جنرل موہن سنگھ گاما کی مار سے بچ نکلا ہے اس کا افسوس سب سے زیادہ کالے خاں کو تھا لیکن رفیا نے اسے اطمینان دلا دیا کہ ''کالے خاں میں بوکو ہوں کو سالا بچ کے کہاں جائے گا۔'' مٹھوا کی کئی دن تک بری حالت رہی لیکن جب اسے یہ پتہ چلا کہ پٹیالہ والے کی فوج بگڑ کر نکل کھڑی ہوئی ہے اور پنجاب کے مسلمانوں کا قتل عام کرتی ہوئی بڑھ رہی ہے تو اس کے چہرے پر پھر تازگی آ گئی۔ علن پنواڑی کی دوکان پر جب یہ خبر پہنچی تو ایک دم سب پہ اوس پڑ گئی۔ مٹھوا کی بات پر تو خیر کبھی بھی یقین نہیں کیا گیا۔ لیکن اس خبر کے راوی تو لارگھو یر دیال تھے۔ حق صاحب خود اپنے کانوں سے ان سے یہ سن کر آئے۔ ایسی صورت میں یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ کئی دن اور کئی راتیں بڑے کرب کے عالم میں گزریں۔ خبریں آتے آتے ایک دم سے بند ہو گئیں ہر شخص پریشان تھا۔ کسی کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور دنیا کس طرف جا رہی ہے۔ آخر اس تذبذب کو ختم کرنے کا سہرا پھر رفیا ہی کے سر رہا۔ اس نے علن کی دوکان پر پہنچ کر بڑے ڈرامائی انداز میں اعلان کیا۔ ''لو میاں وس سالے پٹیالہ والے کا تو کباڑا ہو گیا۔''

سب کے سب چونک پڑے ''کیسے؟''

رفیا نے پڑے پر بیٹھتے ہوئے کہا کہ ''اجی سالا پٹیالا والے عقلمند بنے تھا۔ مگر حیدر آباد کے نواب نے بھی نہلے پہ دہلا مارا۔ سب دھری رہ گئی سالے کی چالاکی۔''

حیدر آباد کے نوات کے حوالہ نے ستم ڈھایا لوگوں کے اشتیاق میں دوگنا چوگنا اضافہ ہو گیا۔ کئی آوازیں ایک ساتھ نکلیں ''یار بتانا کیا ہوا؟''

رفیا بڑے اطمینان سے بولا۔ ''ہاں ہاں یار بتاؤں ہوں۔ اے او علن مرغی والے کبھی کبھی تو اپنے داداؤں کو بیڑی پلا دیا کر۔''

رفیا نے بروقت سوال ڈالا تھا۔ علن نے جھٹ پٹ بیڑی نکال اسے تھمائی۔ رفیا منہ سے بیڑی لگاتے ہوئے بولا۔ ''میاں میں بھی تو کہوں کہ حیدر آباد کو کیا سانپ سونگھ گیا ہے۔ مگر وے بھی موقعہ کی تاک میں تھا۔'' یہ کہہ کے اس نے بڑے آرام سے بیڑی سلگائی۔ لوگوں کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے تھا۔ لیکن رفیا نے ان کے اشتیاق اور ان کے اضطراب کا احترام کچھ ایسا ضروری نہ سمجھا۔ بیڑی سلگانے کے بعد اس نے ایک زور کا کش لیا اور کہنے لگا۔ ''سالے پٹیالے والے نے چال چلی تھی کہ میری فوج مجھ سے بگڑ گئی حیدر آباد کا نواب کہاں چونکے تھا۔ اس نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ میری ایک پلٹن باغی ہوگئی ہے۔''

''اچھا۔'' سب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں۔'' رفیا بولا۔ ''اب رہے گی برابر کی چوٹ۔''

''برابر کی چوٹ؟'' کالے خاں کے لہجہ میں ایک حقارت کا پہلو بھی تھا۔ ''بھتنی کے باولا ہوا ہے۔ حیدر آباد تو منٹوں میں پٹیالہ کی فوج کو چرمر کر دے گا۔''

دراصل کالے خاں بہت آگے نکلا جا رہا تھا۔ علن ابھی پہلی ہی منزل میں تھا۔ اس نے کالے خاں کی گفتگو کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں بے رفیا یہ خبر اخبار کی ہے؟''

''سن رہے ہو جی اس سالے کی باتیں۔'' رفیا پورے مجمع کی عقل سے خطاب کر رہا تھا۔ ''اے گھاس کھا گیا ہے ایسی خبریں کہیں اخباروں میں آسکیں ہیں۔ حیدر آباد سے سپو میاں کا ایک دوست آیا تھا وہ کہہ رہا تھا۔ جھوٹ مانے تو جا کے سپو میاں سے پوچھ لے۔''

کالے خاں بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''مگر یار ووے حیدر آباد کی پلٹن کدھر گئی ہے؟''

رفیا نے ہر سوال کا بے ساختہ جواب دینے کا تہیہ کیا تھا۔ مگر اس سوال پہ سٹپٹا گیا۔ لیکن یہ سوال اکیلے رفیا سے نہیں تھا۔ سب ہی کچھ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ علن اس انداز میں سر کھجا رہا تھا گویا اس معمہ کو سلجھانے کی ساری ذمہ داری اسی کے سر ہے۔ بہت سوچ ساچ کر بولا ''پہلے تو امرتسر کی طرف جائیں گی۔''

''ہوں۔'' رفیا بولا۔ اب تک امرتسر ہی میں بیٹھی ہیں۔ میاں اب تو دلی کو چل پڑی ہوں گی۔''

شیرو پہلے ٹکٹکی باندھے علن کو دیکھ رہا تھا۔ پھر رفیا کے چہرے پر اس کی نگاہیں جم گئیں۔ کالے خاں بھی کچھ کہنے کی نیت باندھ رہا تھا لیکن شیرو کو جانے کیا ہوا بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور کالے خاں کے دل کی بات دل ہی دل میں رہ گئی۔

مٹھوا کو جب یہ پتہ لگا کہ حیدر آباد کی ایک پلٹن امرتسر پہ جا ٹوٹی ہے تو اس کے تو حواس باختہ ہو گئے۔ اسی عالم میں یہ خبر پہنچی کہ ہندوؤں میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی ہے راجپوتوں نے تلواریں سونت لی ہیں اور جاٹ کہتے ہیں کہ دلی سے لے کر میرٹھ تک ہم اپنی حکومت قائم کریں گے۔ مٹھوا کا منہ اتنا سا نکل آیا۔ جب دلی سے گڑبڑ کی خبریں آئیں تو وہ مطلق یہ نہ مجھ سکا کہ جاٹوں نے دلی پر حملہ کیا ہے یا راجپوتوں نے ہلہ بولا ہے۔ یہ انکشاف رفیا نے کیا تھا کہ لڑائی ہندو مسلمانوں میں ہوئی ہے۔ یہ بھی اسی نے سنایا تھا کہ پہلے دن تو مسلمان بہت پٹے۔ لیکن دوسرے دن میواتیوں نے ہلہ بول دیا اور پورے کناٹ پلیس میں آگ لگا دی پشاور سے پٹھانوں کے چل پڑنے کی خبر کون لایا اور کہاں سے لایا اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کم از کم رفیا تو اس کا راوی نہیں بنا۔ اور مٹھو سے تو یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی کون مارتا ہے۔ اس خبر سے اس کے تو پیٹ میں درد ہونے لگا۔ کالے خاں کا دماغ عرش معلیٰ پر تھا۔ اب تو وہ کالے آدمی سے بات نہیں کرتا تھا۔ البتہ علن نے ذرا قنوطیت کا مظاہرہ کیا۔ کہنے لگا۔ ''اماں بات یہ ہے کہ پتھر اپنی جگہ پہ بھاری ہووے ہے۔ پٹھانوں کی دلی میں دال نہیں گلے گی۔''

اس پر کالے خاں بہت بگڑا۔ ''لو اس بھتنی والے کی سنو۔ ابے پٹھان گئے جھنڈے گاڑ دیئے۔ میاں میں نے لڑائی میں یہ دیکھا کہ جہاں لڑا پٹھان لڑا۔ سالے گورے تو لونڈیوں کو پٹاتے پھرتے تھے۔ میں تو یہ کون ہوں کہ اگر پٹھانوں کی پلٹن نہ ہوتی تو اس لڑائی میں انگریزوں کا دبہ گول تھا۔''

انگریزوں کی تذلیل پر علن بہت گھٹا۔ بولا۔ ''یار انگریز کی بات مت کروس کا اور پٹھان کا کیا مقابلہ۔''

''لو بولو۔'' کالے خاں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''یہ ٹکیا چوٹے سالے انگریز پٹھانوں کا مقابلہ کریں گے۔ میں وے تو تکڑم لڑاوے ہیں۔ پٹھان لڑتا ہے۔ ون سالوں نے خود مانا ہے کہ ہاں بھئی لڑائی میں پٹھانوں نے بڑی بہادری دکھائی۔''

''دل بڑھانے کو کہہ دیا ہوگا۔'' علن نے بے ساختہ جواب دیا۔

کالے خاں اور بھن گیا۔ ''لو جی یہ چوٹی والے پٹھانوں کا دل بڑھائیں گے۔ ون کا دل تو خود قبوتری کا سا ہے۔''

رفیا بہت دیر سے خاموش بیٹھا تھا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''کالے خاں چھور بھی کس کے منہ لگے ہے۔ میں یہ کہوں اوں کہ دیر کونسی ہے۔ اب پٹھان آئے دیکھ لینا کیا ہوئے ہے میاں جب وہ دعا دگا کرتے آئیں گے تو سکھوں اور جاٹوں کی تو میا مر جائے گی۔''

علن نے طنزاً جواب دیا۔ ''ہاں جی چٹکیوں میں دلی فتح کر لیں گے۔''

''پیارے دیکھتا رہ۔ لال قلعہ پہ''

''ابے یار گولی مار لال قلعہ کو۔ ذرا بیڑی تو پلا۔'' شیرو بھی خاموش بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا تھا۔ رفیا نے کوئی بہت طنطنہ کا فقرہ کہنے کی نیت باندھی تھی۔ مگر شیرو نے ٹنگڑی ماردی۔ اس نے کان میں لگی ہوئی بیڑی نکال کر جلدی سے شیرو کے حوالے کی۔ یہ عجلت اس نے شاید اس لیے برتی تھی کہ وہ اپنی بات پھر شروع کر دینی چاہتا تھا۔ لیکن شیرو نے اسے موقعہ ہی نہیں دیا۔ اس نے بیڑی منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''سالو بہت دون کی لے رئے ہو۔ یہ بتائے دوں ہوں'' یہ کہتے کہتے وہ علن سے مخاطب ہو گیا۔ ''ابے علن دیا سلائی دیجو بے۔'' علن نے اسے دیا سلائی کی ڈبیا دے دی اور ساری نگاہیں شیرو کے چہرے پر جم گئیں گویا وہ کوئی بہت بڑا انکشاف کرنے والا ہے۔ شیرو نے اطمینان سے بیڑی سلگائی اور دیا سلائی کی بجھی ہوئی تیلی پھینکتے ہوئے بولا۔ ''بچو یہ بتائے دوں ہوں بڑا خون خرابا ہو گا۔''

چند لمحوں کے لیے سکوت چھا گیا۔ پھر کالے خاں تڑپ کر بولا۔ ''خون خرابا تو ہوگا۔ تو جورو کے پاس دبک کے بیٹھ جائیو۔''

رفیا نے ٹکڑا لگایا۔ ''ابے یار کالے خاں امرتسر والوں سے تیری تو یاری ہے۔ وہیں لکھ بھیج کہ لاہور کو اتنی چوڑیں بھیجدیں دو چوڑیں ادھر بھی بھیجدو۔''

شیرو نے کالے خاں اور رفیا دونوں میں سے ایک کے فقرے کا بھی اثر قبول نہیں کیا۔ بڑی بے اعتنائی کے ساتھ بولا۔ ''بس ہم نے تمہیں بتا دیا ہے۔''

اور شیرو پھر کسی سوچ میں پڑ گیا۔ مجمع پر خاموشی چھا گئی۔ آخر کوئی ایک منٹ کے بعد علن بولا۔ ''یار شیرو تو منہ زوری کیا کرے ہے۔''

کالے خاں بولا۔ ''یہ سالا پٹھانوں کو نہیں جانتا۔'' اور اس کے بعد اس نے پٹھان رجمنٹ کی بہادری کے قصے سنانا شروع کر دیئے۔ پھر رفتہ رفتہ رفیا نے یہ محسوس کیا کہ کالے خاں کا جوش دھیما پڑتا جا رہا ہے۔ اس نے بڑی عقلمندی سے گفتگو کا ذمہ اپنے سر لیا اور سبطین کے علم و فضل کے قصے سنانے شروع کر دیئے۔ پھر نا معلوم کسی وقت اور کس طرح پٹڑی بدلی اور گفتگو کا موضوع سبطین کی بجائے حق صاحب اور نمبردار صاحب بن گئے۔

رفیا کہہ رہا تھا۔ ''یار مجھے تو اس پہ آوے ہے کہ وکیل صاب کو کلمہ خود نئیں آتا اور دوسروں کو سکھاتے پھرے ہیں۔''

''یہ میں نئیں مانتا'' علن نے فوراً اس کی تردید کی۔ ''میاں آخر کو تو وہ وکیل ہے اور پھر وس کی اتنی عمر ہے۔ تجھ سے تو وہ دوگنا تگنا بڑا